نئی امریکی سامراجیت اور ہم عصری کے امکانات

تحریر: جیمز پٹزل*

ترجمہ: سید محمد علی بن عزیز

سوویت یونین کے ختم ہو جانے کے بعد ایک نئی پرامن دنیا کے بارے میں وہ عہد جو اس وقت اس لیے کیا گیا تھا کہ دنیا میں ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی وہ دوڑ جس سے دنیا کو کئی بار تباہ کیا جا سکتا ہے ختم ہو جائے گی، خواب و خیال ہو گیا۔ اس کے برعکس ہم خود کو ایک ایسی دنیا میں پاتے ہیں جو غیر مستحکم ہے، جہاں کئی چھوٹے چھوٹے علاقوں میں پرتشدد تنازعات پائے جاتے ہیں، جہاں دنیا کے دور دراز علاقوں میں دنیا کے متمول ترین ممالک کی جانب سے مہنگی عسکری مہمات کی جاتی ہیں اور عالمی سطح پر دہشت گردی کے سلسلوں میں اضافے کے باعث عدم تحفظ کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کی واحد بڑی طاقت کے طور پر ابھری ہے جہاں دنیا کی تقریباً ۴٫۸ فیصد آبادی موجود ہے مگر جہاں ۲۰۰۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی ۳۲ فیصد دولت پر یہی ملک قابض نظر آتا ہے[1]۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے جنگی اخراجات کی عیاشی بھی یہی ملک کرتا ہے۔

میں یہاں مائیکل اگناتیف کے استدلال سے استنباط کروں گا جہاں وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ امریکہ کا رویہ شاہانہ ہے۔ اس لیے کہ وہ مختلف ممالک اور منڈیوں پر مشتمل دنیا کو ہمیشہ اپنے قومی مفاد کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ البتہ میں اگناتیف کی اس بات سے اتفاق نہیں کروں گا کہ امریکہ ایک درانداز رویہ رکھتا ہے۔ میں اس سے بھی متفق نہیں ہو سکتا کہ وہ اخلاقی لحاظ سے پست اور متذبذب سامراجی مقصد رکھتا

---

* جیمز پٹزل (James Putzel) لندن سکول آف اکنامکس کے شعبۂ ڈویلپمنٹ اسٹڈیز کے سربراہ ہیں۔ زیر نظر مضمون ڈویلپمنٹ ریسرچ سنٹر، لندن سکول آف اکنامکس سے ڈسکشن پیپر نمبر ۲ کے ذیلی عنوان کے ساتھ جنوری ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔

ہے یا یہ کہ وہ یقیناً انسانی اصولوں پر یقین رکھنے والی سلطنت ہے۔ اسی طرح میں اس کی اس بات سے بھی اتفاق نہیں کر سکتا کہ جمہوریت کے حصول کے لیے سامراجیت شرط ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ اس تحریر کے لیے بالخصوص برسبیل دلیل اگناتیف کو امریکہ کی سلطنت آرائی میں ایک ذیلی فریق کے طور پر حصہ لیتے ہوئے امریکہ کی اقتدا کرنی چاہیے۔ میں اس کے برعکس یہ رائے دینا چاہوں گا کہ آج بین الاقوامی امور میں موجود ایک واضح تقسیم کے نتیجہ میں کثیر الجہتی نظام اور امریکہ کا یک طرفہ سامراجی طرز عمل ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑے ہوئے ہیں۔

بقائے باہمی کے امکانات سے میری کیا مراد ہے؟ مختصراً یہ کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس غیر متوازن دنیا میں جنگ کے بجائے امن کے حالات کے تحت تبدیلی اور ترقی کے کیا امکانات ہیں، پرامن بقائے باہمی'' کی اصطلاح ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آخر اور ۱۹۶۰ء کی دہائی کے قریب نکیتا خروشیف کی کیمونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس کے موقع پر سوویت یونین میں ایک سیاسی مقصد کے تحت استعمال ہوئی تھی۔ یہ کشیدگی میں کمی کا آغاز تھا جس میں یہ رائے دی گئی تھی کہ سرمایہ دار مغرب، اشتمالی مشرق سے امن کے حالات میں بھی مقابلہ کر سکتا ہے۔ کارل پولینی اور دیگر تمام افراد جو ایک عمومی بقائے باہمی کی داغ بیل ڈال رہے تھے، ایک ایسی وسیع کوشش کا حصہ تھے جو آہنی پردے کے اس پار تعلقات قائم کرنا چاہ رہے تھے جو ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ جیسے مجنونانہ اقدامات سے دوری کی طرف ایک قدم تھا یا پھر ایٹمی ہتھیاروں کی ایسی دوڑ (جس سے باہمی تباہی یقینی ہوتی)، جیسے مجنونہ اقدامات سے دوری کی طرف ایک قدم تھا۔ اس مسودے کے پہلے نکتے میں جان سمرویلی نے یہ اعتراض کیا کہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ فکری تضادات کے ان پہلوؤں کو سمجھا جائے جو عالمی امن کی راہ میں یا تو ممد و معاون ہوں یا کم از کم مزاحم نہ ہوں۔ مفکرین نے اپنے اپنے خیالات میں تقابل کا فیصلہ کیا جو کیمیائی ہتھیاروں کے موضوع سے ہٹ کر ہوں تا کہ ماضی کے رجحان سے ہٹ کر تنازعات کے ماحول میں اہم نوعیت کے چند تصورات قائم کیے جائیں جن کی بنیاد پر آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا جا سکے۔

اسلامی دنیا اور مغرب کے مختلف النوع نظام ہائے سرمایہ داری کے امن بقائے باہمی کے اصول کے تحت موجود رہنے کے کیا امکانات ہیں؟ اس مسودے پر بنیادی اعتراض یہی ہے کہ فقط کثیر الجہتی نظام

کے احیاء سے ہی عالمی برادری امن کے زیادہ سے زیادہ امکانات کی امید رکھ سکتی ہے۔ اگلے حصے میں میں نے بش کے گزشتہ تین برسوں میں تشکیل کردہ سامراجی نظام خصوصاً ان کی قومی سلامتی کی حکمت عملی کا جائزہ لیا ہے۔ میں جارحانہ حکمت عملی میں کمی کے حوالے سے معاہدہ ماسکو کو امریکی فوج کی فیصلہ کن فتح سمجھتا ہوں۔ میں نے بعدازاں امریکہ کے سامراجی مقاصد میں اس کی معاشی بنیادوں کا بھی مختصراً جائزہ لیا ہے تا کہ اس رائے کا اظہار کرسکوں کہ اس کی برتری ممکنہ طور پر مختصر بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ تیسرے حصے میں میں نے عراق پر امریکی برطانوی حملے کے سیاسی اور معاشی مقاصد کا احاطہ بھی کیا ہے۔ میں آخر میں سامراجی مقاصد کے مقابل آنے والی ابھرتی ہوئی رکاوٹوں پر (اور اس بنیاد پر کہ جس پر یہ رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں)، توجہ مرکوز کرتا ہوں۔

نئی امریکی سامراجیت

نیویارک اور واشنگٹن پر ہونے والے دہشت گردی کے حملوں کے ٹھیک ایک برس بعد ۲۰ ستمبر ۲۰۰۲ء کو صدر جارج بش نے اپنی قومی سلامتی کی حکمت عملی کے ضمن میں سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں امریکہ کے مقام کے بارے میں اپنے نئے تصور کی وضاحت کی۔ بش کی قومی سلامتی کی یہ حکمتِ عملی دراصل اس امریکی نیت کا اعلان تھا جس کے مطابق وہ دنیا کو ''دہشت گرد'' ملکوں اور ان کی سرپرستی میں چلنے والی دہشت گرد تنظیموں سے ''چھٹکارا'' دلانا چاہتا ہے۔ اس مسودے میں وائٹ ہاؤس نے اپنے آپ کو کہیں بھی، کبھی بھی اور کسی پر بھی حملہ کرنے کا مجاز ٹھہرایا چاہے وہ کوئی ملک ہو یا غیر سرکاری تنظیم، مگر اس کی وجہ سے خود امریکی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو، امریکی حکومت اس سے قبل ان تمام بین الاقوامی قوانین اور معاہدوں پر تحفظات کا اظہار کرتی رہی ہے جس سے اس کے تنہا اقدام کرنے کی صلاحیت صلب ہوتی نظر آئے۔ بش کی حکمت عملی اس دھارے سے واضح طور پر مختلف رخ پر ہے جو ممکنہ طور پر بین الاقوامی نظام کی کثیر جہتی حکومت کی طرف ایک سفر ہوسکتا ہے۔

سد باب کے طور پر کیے جانے والے خطرات سے پاک حملے

بش کی قومی سلامتی کی حکمت عملی کی روشنی میں بیان کردہ دنیا میں امریکہ اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ

کون دوست ہے اور کون دشمن، کون سے ممالک تہذیب یافتہ ہیں اور کون سے غیر مہذب، آزادی کے لیے لڑنے والا کون ہے اور دہشت گرد کون؟ یہ نظریہ بین الاقوامی قانون کے بنیادی تصور کو نظر انداز کر دیتا ہے جس میں عسکری اقدام صرف دفاعی صورت میں درست قرار پاتا ہے (دیکھیے اقوام متحدہ کا چارٹر آرٹیکل ۵۱)۔ جب وہ یہ بیان کرتا ہے کہ امریکہ ہر اس خطرے کے خلاف (اس کے مکمل طور پر سامنے آنے سے) پہلے ہی اقدامات کر ڈالے گا۔ اگرچہ امریکہ خطرات کی نشان دہی کے لیے اپنے حلیفوں سے رجوع کرے گا اور بین الاقوامی برادری سے اس سلسلے میں امداد بھی طلب کرے گا تاہم قومی سلامتی کی حکمت عملی کے بیان کے مطابق ''ہم تنہا اقدام کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے، اگر ہمارے لیے اپنے دفاع کا حق ان دہشت گردوں کے خلاف شافعی طور پر استعمال کرنا ضروری ہوا تو ہم اسے ان کے اپنے ملک اور عوام کو نقصان پہنچانے سے پہلے ہی استعمال کریں گے''۔

آزادی اور اس کی حفاظت کی تعریف کے لیے امریکہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں اپنی دیگر ممالک میں در اندازیوں کی عالمی اداروں کی جانب سے جانچ پڑتال کے بارے میں انتہائی حساس ہے۔ کلنٹن انتظامیہ نے جہاں عالمی ادارہ انصاف کے قیام میں بھرپور کردار ادا کیا تھا، وہیں بش انتظامیہ نے واشگاف الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو بین الاقوامی قانون کے اس ادارے میں پیش نہیں کریں گے۔ قومی سلامتی کی حکمت عملی میں امریکہ کے اس عزم کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ ہر اس ملک کی عسکری امداد بند کر دیں گے جو کسی امریکی شہری کو اس ادارے سے ماورا نہ سمجھے جو جوناتھن گریلا (جو کہ امریکی ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو میں ریپبلکن اکثریت کا نمائندہ ہے) اور کانگریس کے ممبر ٹام ٹوڈی کے الفاظ میں ''خراب عدالت'' ہے۔

امریکہ کے لیے جوہری ہتھیار جمع کرنے کی آزادی

نیو یارک اور واشنگٹن پر ہونے والے دہشت گردی کے حملوں سے بھی پہلے ری پبلکنز نے دنیا میں ہتھیاروں کے پھیلاؤ سے متعلق ہونے والے کثیر جہتی معاہدوں کے بارے میں اپنا تبدیل نہ ہونے والا رویہ دکھا دیا تھا۔ درحقیقت بش کی صدارت حاصل کرنے کی کوشش کے دوران ہی عنقریب اس کی قومی

سلامتی کے مشیر کے عہدے پر فائز ہونے والی خاتون کونڈا لیزا رائس نے کلنٹن پر امریکی مفادات پر ایک خیالی عالمی برادری کے مفادات کو ترجیح دینے کا الزام لگایا تھا۔

اب جب کہ امریکہ اپنے لیے اپنے آئندہ کے جوہری پروگرام میں تبدیلی کرنے کا پورا حق رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ قومی سلامتی کی حکمت عملی کے مطابق ایک ایسا لائحہ عمل اختیار کرے گا جس کے نتیجے میں خود تو دفاعی مقصد سے اپنی جوہری طاقت میں اضافہ کر سکے لیکن ساتھ ہی جوہری توانائی کی منتقلی پر پابندیوں پر بھی اصرار کرے تاکہ ''خراب ممالک'' اور دہشت گرد تنظیموں کے ہاتھ تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں میں کام آنے والا مواد، ٹیکنالوجی اور تجربہ نہ آ سکے اور وہ یہ سب کچھ اس لیے چاہتا ہے کہ جب وہ اپنے خیال میں کسی ''بدمعاش'' ملک یا اس کی سرپرستی میں چلنے والی کسی ''تخریب کار'' تنظیم کے خلاف کارروائی کرنا چاہے تو اسے کم سے کم مزاحمت کا سامنا ہو۔ اس وقت جبکہ وقتی طور پر بش انتظامیہ نے چین سے معاندانہ رویہ ترک کر دیا ہے اور اسے ''خراب ممالک'' کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے، قومی سلامتی کی حکمت عملی صرف امریکہ کے لیے جوہری ہتھیاروں کی صلاحیت بڑھانے کی بات کرتی ہے اور اس کے خیال میں اس صورت حال میں چین کے لیے بھی ایک چھپا ہوا خطرہ موجود ہے کیونکہ امریکہ کے خیال کے مطابق چین کا جدید ترین اسلحے کے حصول کا پروگرام دوراز کار ہے اور یہ کہ اس سے اس کے ہمسایہ ممالک میں اس کے قومی وقار کو دھچکا لگ سکتا ہے۔

جوہری تجربات نہ کرنے کے معاہدے کی دھجیاں اڑانا، ہتھیاروں کی دوڑ کی روک تھام کا روس کے ساتھ معاہدے کے ذریعے انکار اور اپنے میزائل ڈیفنس سسٹم کو آگے بڑھانا ایسے واضح اقدامات ہیں جو یک طرفہ سامراجیت کے عکاس ہیں اور جن سے جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کی کوششوں کی حوصلہ شکنی ہوگی۔

امریکہ کے سامراجی عزائم کی معاشی بنیادیں

امریکہ عالمی معیشت میں ایک اثر انگیز مقام رکھتا ہے۔ یہ دنیا کی ۶ء۴ فیصد آبادی پر مشتمل ہونے کے باوجود ۲۰۰۲ء میں اس کے پاس دنیا کی ۳۲ فیصد قومی آمدنی موجود تھی۔ روس ۲ء۳ فیصد آبادی کا حامل

ملک فقط ایک فیصد قومی آمدنی کے ساتھ اپنی عالمی معیشت میں غیر اہم حالت کا غماز ہے۔ ۱۵ ممالک کا اتحاد یورپی یونین معاشی لحاظ سے امریکہ کا قریب ترین حریف ہے جہاں دنیا کی ۶ فیصد آبادی اور ۲۴ فیصد آمدنی پائی جاتی ہے۔ یورپی یونین کے بعد امریکہ کا معاشی حریف جاپان ہے جہاں دنیا کی ۲ فیصد آبادی اور ۱۳ فیصد آمدنی ہے اور اگر اسے چین کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ ۲۳ فیصد آبادی اور ۱۸ فیصد آمدنی کی نمائندگی کرنے والا علاقہ بن جاتا ہے۔

دفاعی اخراجات میں بھی دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں امریکہ کی برتری واضح ہے۔ امریکی معیشت واضح طور پر توانائی کا منبع (powerhouse) ہے۔ امریکہ کا عالمی تجارت میں حصہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ہم دنیا کی تجارت کا جدول تبدیل کر کے یورپی ممالک کی آپس میں کی جانے والی تجارت کو ایک اکائی تصور کریں اور اسے بین الاقوامی کی بجائے مقامی تجارت سمجھیں تو ہم حکمت عملی کے اعتبار سے دنیا کے بڑے مراکز تجارت کی طاقت کو زیادہ وضاحت سے سمجھ سکیں گے۔

۲۰۰۲ء میں امریکہ نے عالمی سطح پر ۶ء۱۴ فیصد برآمدات اور ۲۴ فیصد درآمدات کیں جبکہ اس کے برعکس یورپی یونین نے ۲۰ فیصد برآمدات اور ۱۹ فیصد عالمی درآمدات کیں۔ ایشیا کی برآمدات ۳۴ فیصد اور درآمدات ۲۸ فیصد تھیں جو اس کے عالمی منڈی میں مضبوط مقام کی نشان دہی کرتی ہیں۔

امریکہ عالمی معیشت میں اپنا مقام اس لیے برقرار رکھے ہوئے ہے کیونکہ وہ دنیا بھر میں اثاثوں کے لیے ایک مقناطیس کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی تجارت اور اخراجات کو بھاری سرمائے سے سہارا دیتا ہے۔ اس کا تعلق یقیناً امریکہ کے نجی شعبے کی کارکردگی سے بھی ہے جہاں تحقیق اور ایجادات میں ابھی تک وہ سب سے آگے ہے۔ امریکہ کی معیشت امریکی ڈالر کی دنیا میں مستحکم حیثیت کی وجہ سے بھی تقویت پاتی ہے جو دنیا میں لین دین اور سرمایہ کاری کے لیے برتر کرنسی مانا جاتا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں ۶۵ فیصد سرکاری اثاثے امریکی ڈالر میں تھے۔ پچھلے دس برسوں میں ۱۹۹۹ء تک امریکی ڈالر کا استعمال بڑھ گیا حتیٰ کہ یورو کو متعارف کرایا گیا جس میں ۲۰۰۲ء تک ۵ء۱۴ فیصد سرکاری اثاثے رکھے گئے۔ اس حقیقت سے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بیرونی اثاثے امریکی ڈالر میں رکھے جاتے ہیں یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ امریکہ کو امریکی ڈالر اس کی استعداد سے زیادہ طاقت مہیا کرتا ہے اور وہ فی کس توانائی سستی قیمت پر حاصل کرتا ہے اور بھاری

عسکری اخراجات کرنے کے قابل رہتا ہے۔

خلاصہ

بش اتحاد کا طاقت حاصل کرنا (میں الیکشن کہنے سے ہچکچا رہا ہوں) امریکی عالمی طاقت کی حکمت عملی میں ایک نمایاں تبدیلی کا اظہار ہے۔ جو اس ابھرتے ہوئے کثیر جہتی عالمی نظام کو جو کلنٹن دور میں سرد جنگ کے بعد شروع ہوا تھا، اس کے بہت دُور ہے۔ ۱۱ستمبر کے سانحے نے نئے قدامت پرستوں (Neo-servatives) کو انتظامیہ کی آڑ میں ایک جارحانہ انداز اپنانے کا موقع مہیا کیا ہے جس کی دراصل ریپبلکن پارٹی کے دائیں بازو نے انتظامیہ کے برسراقتدار آنے سے بہت پہلے وکالت شروع کر دی تھی۔ بش کی قومی سلامتی کی حکمت عملی اسی جارحانہ انداز کا نظریاتی اظہار تھی جس کے امریکہ کے دشمن خیال کیے جانے والے افراد کے خلاف ازخود چڑھائی کرنے کے اعلان سے بش کی قومی سلامتی کے نظریات ظاہر و واضح ہو جاتے ہیں اور بین الاقوامی قانون کی تشریحات پر حکمرانی کے مقابلہ کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ نئی انتظامیہ نے گرین ہاؤس گیس کے اخراج کے بارے میں موجود معاہدہ کیوٹو سے منہ پھیر لیا اور کھل کر کہا کہ یہ امریکی مفادات کے خلاف ہے۔ یہ اقدامات واضح کرتے ہیں کہ امریکہ اقوام متحدہ کو عالمی معاملات حل کرنے کا ادارہ نہیں سمجھتا۔ عراق جنگ کے مسئلے میں امریکہ نے ثابت کیا کہ اس کے یک طرفہ اقدامات سے اقوام متحدہ کو نہ صرف نظرانداز کیا گیا ہے بلکہ اس کے بالکل برخلاف کارروائی کی گئی ہے۔

عراق جنگ کے مقاصد

بش انتظامیہ نے عراقی جنگ کو امریکی عوام میں قابل قبول بنانے کے لیے صدام حسین اور اسامہ بن لادن کا القاعدہ سے تعلق جوڑ کر پیش کیا۔ بش کا یہ بیان کہ "تنازعہ دوسروں کی مرضی کے وقت اور شرائط پر شروع ہوا تھا، اور یہ ہماری منشاء اور ہمارے وقت پر ختم ہوگا"، ۱۱ستمبر پہلے افغانستان اور بعد ازاں عراق میں جنگ کرنے کا جواز بن گیا۔

امریکہ کے عراق کے خلاف اقدام کرنے کی کئی وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے

دعویٰ کیا کہ وہ اقوام متحدہ کی عراق کو ہتھیاروں سے غیر مسلح کرنے کی قراردادوں پر عمل درآمد کرانا چاہتے ہیں اور اس لیے کہ عراق کے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے بین لاقوامی امن کو خطرہ لاحق ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ عراقیوں کو صدام حسین کی مطلق العنان حکومت سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور اس طرح جنگ کا اخلاقی جواز پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

میں ان تمام جوازوں کو سامنے رکھ کر اس رائے کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ عراق جنگ میں امریکہ کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ مشرق وسطیٰ کو اپنی حکمت عملی کے تحت مستقل تیل حاصل کرنے کے لیے محفوظ بنانا یا بالفاظ دیگر یہ جنگ تیل کے ذخائر پر امریکہ کے قبضے کو ممکن بنانے کے لیے تھی اور ۲۔ امریکہ کا اپنی نئی حکمت عملی کے تناظر میں اپنے دفاع اور یک جہتی کے لیے طے شدہ عزائم کا مظاہرہ جس میں اس کی فوجی برتری کا ایسا اظہار ہو جس میں اقوام متحدہ کے بالمقابل اس کا کردار بھی واضح ہو جائے اور مقامی سطح پر مزید عسکریت کرنے اور بش کو اگلے الیکشن میں کامیاب ہونے کے لیے بھی جواز مہیا ہو سکے۔

مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر کو محفوظ بنانا

اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ امریکہ کی عراق میں دراندازی کا بنیادی مقصد اپنی حکمت عملی کے ایک حصے یعنی مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر کو اپنے لیے محفوظ بنانے پر مشتمل تھا۔ حکمت عملی کے مسودے کے مطالعے سے ریپبلکن پارٹی کے بش کے اقتدار حاصل کرنے سے بھی پہلے سے موجود عزائم سامنے آئے ہیں اور اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ امریکہ کے عالمی سربراہ کی حیثیت سے رہنے کے لیے مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر پر قبضے کو طاقت کے توازن کو مریکہ کے حق میں قائم رکھنے کے لیے ضروری امر خیال کرتے ہیں۔

بش حکومت کے پہلے سال میں حکمت عملی کے ایک اور پیش کردہ مسودے میں مغرب اور امریکہ کی تیل کی ضروریات کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ اس رپورٹ کا واضح پیغام، جو کونسل برائے خارجہ امور کے لیے تھی، یہی ہے کہ وسیع تر سرمایہ کاری کے لیے مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر کو امریکہ کے لیے محفوظ کر لیا جائے تا کہ وہ عالمی منڈی کو مسلسل ترسیل کے لیے میسر رہیں۔ عراق کو ایک تباہ کن اور وحشی چیز کی طرح پیش کیا

گیا۔ عراق کے پاس تمام مشرق وسطیٰ میں تیل کے سب سے زیادہ ذخائر ہیں۔ انتظامیہ کے تجزیہ کاروں نے صدام حسین کو اس قابل سمجھ لیا تھا کہ وہ تیل کے ذریعے امریکہ سے مفادات کا کھیل کھیل سکتا تھا۔ انہوں نے اسے امریکہ کے متوقع مخالف کی حیثیت سے بھی دیکھنا شروع کر دیا تھا جو تیل کی ترسیل درہم برہم کر کے امریکہ کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ عراقی حکومت کے خلاف پابندیاں برقرار رکھنے سے تیل کی عالمی منڈی میں سرمایہ کاری بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اس معاملے کو سلجھانے کے لیے صدام حکومت سے نجات حاصل کرنا ازبس ضروری تھا۔

تاہم، یہ معاملہ چونکہ امریکہ کے لیے حکمت عملی کے لحاظ سے اہم ہے اور مستقبل میں بھی ایک فوری خطرہ بن کر سامنے آ سکتا ہے، اس بات کے بھی ثبوت موجود ہیں کہ وہائٹ ہاؤس اور پینٹاگون اس بارے میں دراندازی کے وقت بھی فکر مند تھے۔ فی الوقت اوپیک (OPEC) سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ تیزی سے تیل کی قیمتوں کے تعین کا طریقہ کار تبدیل کرے گی۔ اس لیے کہ اس وقت رقم کی ترسیل کی قیمت بہت چڑھی ہوئی ہے۔ فی الوقت زر مبادلہ کے ذخیروں میں تیزی سے اضافے کی توقع ہے جیسا کہ اس طویل دورانیے سے ظاہر ہے جس میں برطانوی پاؤنڈ نے بین الاقوامی ذخائر میں اپنی ممتاز حیثیت بحال رکھی۔ اگرچہ کافی عرصے سے امریکی ڈالر ایک متبادل کرنسی کی صورت میں موجود تھا۔ میرے خیال میں عراق کی طرف سے تیل کی ترسیل میں رخنہ اندازی کا خدشہ اور اس سے امریکہ مخالف رویے کو مشرق وسطیٰ میں پھیلانے کے خطرے نے اس کے یورو کی طرف رخ کرنے کے خدشے نے امریکہ کو دراندازی کی فیصلے پر مجبور کرنے میں زیادہ اہم کردار ادا کیا۔

عراق میں دراندازی کا منطقی جواز

عراق پر حملے کا ثانوی مقصد ایک ایسے کمزور حریف پر طاقت کے اظہار کے ذریعے دفاعی حکمت عملی میں حملہ کرنے کے نظریے کی عملی طور پر حجت قائم کرنا بھی تھا۔ یہ اقوام متحدہ کے مقابلے میں اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی تھا۔ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ بش انتظامیہ فقط اس صورت میں اقوام متحدہ میں جانے پر تیار تھی جبکہ وہاں اس کی مرضی کی بات ہو یعنی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اس کے عراق پر حملے کی حمایت

کرے۔اس سے کم کوئی بھی چیز امریکہ کے لیے ناقابل قبول تھی۔جب (برطانیہ نے) اسے اس بات پر قائل کرلیا کہ سلامتی کونسل میں اپنی بات پیش کرے تو اس نے صرف اپنی شرائط پر اس کو پیش کیا۔امریکہ مصالحت کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔عراق پر اس لحاظ سے اس لیے حملہ کیا گیا کہ امریکہ کی اس کی نئی دفاعی حکمت عملی پر عمل کرنے کے فیصلے پر سنجیدگی سے عمل پیرا ہونے کی نیت رکھنے کا تاثر قائم کیا جا سکے۔اس خیال کو مزید تقویت اس وقت ملتی ہے جب ہم امریکہ کی عراق پر حملے کی بیان کردہ وجوہات کا جائزہ لیتے ہیں جن میں وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے عالمی برادری کی حفاظت اور ساتھ ہی عراقی عوام کے انسانی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ شامل ہے۔عراق کی جنگ کے جواز میں رنگ بھرنے میں،عیسائی بنیاد پرستوں کے، جو کہ ریپبلکن پارٹی کی قیادت سے نہایت قریب ہیں،خوفناک عقائد بھی دخیل وکارفرما ہیں۔

وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی بات فقط حملے کا ایک قانونی جواز پیدا کرنے کے لیے کی گئی تھی جس سے یہ کہا جا سکے کہ امریکہ کا یہ اقدام عراق کے بارے میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کو پورا کرنے کی عملی کوشش ہے جس میں عراق کو ان ہتھیاروں سے غیر مسلح کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔حالانکہ اقوام متحدہ کی رپورٹوں میں یہ بات پہلے ہی کہہ دی گئی تھی کہ عراق کے اکثر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ۱۹۹۰ء کی دہائی میں تباہ کر دیے گئے تھے۔

عراق کی بعث پارٹی کی ظالمانہ فطرت کے بارے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں تھا جس کو ۸۰ء کی دہائی میں امریکہ اور برطانیہ کی مکمل تائید حاصل تھی۔یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ عراق میں دراندازی، فتح اور قبضے کی وجہ سے، پیدا ہونے والی محرومی اور نقصانات مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں عراقیوں کی زندگی میں کوئی بہتری نہیں لائیں گے۔عراق امریکی دراندازی اور قبضے کے نتیجے میں ایک ناکام ریاست بن گیا ہے جہاں عمارتیں تباہ اور کاروبار زندگی برباد ہو چکا ہے جبکہ افراتفری اور خوفزدگی کا ایک طویل دور شروع ہو چکا ہے۔امریکہ کے عراق کو اقوام متحدہ کے زیر نگرانی قائم کیے جانے والے نظام کے تحت نہ دینے سے یہ حالات ایک لمبے عرصے تک برقرار رہ سکتے ہیں۔لہٰذا عراق پر اقوام متحدہ سے رائے لیے بغیر حملہ کرنا اور اس پر اقوام متحدہ کی نگرانی کے بغیر قبضہ برقرار رکھنا ایک ایسا اقدام ہے جس کی کوئی قانونی اور اخلاقی دلیل دینا

ناممکن نظر آتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ امریکہ اور اس کی برطانوی پیروکاروں نے عراقی نظام ریاست کو ختم کر دینے کے نتیجے میں ہونے والی مخالفت کی شدت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ ایک ایسا ملک جہاں تشدد کے واقعات اور گوریلا جنگ طویل مدت تک جاری رہے، اس میں سرمایہ کاری کے لیے وہ متوقع فضا قائم ہونا نہایت دشوار ہے جس کا خواب امریکہ کی حکمت عملی مرتب کرنے والوں نے دیکھا تھا۔ اس سب کے باوجود عین ممکن ہے کہ وہائٹ ہاؤس سے زیادہ قریبی نظریاتی گروہ کے نزدیک مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر کے متعلق امریکی مفاد اس قدر اہم نہ ہو۔ یہاں ریپبلکن پارٹی کے دائیں بازو میں یہ تفہیمی عنصر نظر آتا ہے کہ دشمن کو ہر قیمت پر شکست دینی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کا ملبہ کہاں گرتا ہے۔ بس یہ ثابت ہو جائے کہ اس سے زیادہ خطرناک واشنگٹن میں موجود وہ پس پردہ عناصر ہیں جو الہامی انداز میں عراق پر حملے اور اسامہ بن لادن کی القاعدہ تنظیم کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کو صلیبی جنگ قرار دیتی ہیں۔ امریکہ میں ڈپٹی انڈر سیکرٹری برائے دفاع اور اسامہ بن لادن کے خلاف کیے جانے والے اقدامات میں انٹیلی جنس کے سربراہ کے عہدے پر فائز لیفٹیننٹ جنرل ولیم جی ''جیری'' بوائکن نے واشگاف الفاظ میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کو امریکہ کی بطور عیسائی ریاست روحانی جنگ بتایا ہے۔

بقائے باہمی کے کیا امکانات ہیں؟

کرہ ارض کو، جسے جنگی تکنیک میں ہونے والی ترقی اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں نے جن میں سے اکثر دنیا کے بدترین ممالک کے صنعتی پلانٹس ہی میں تیار کیے گئے ہیں، پہلے ہی رہنے کے لیے نسبتاً کم محفوظ جگہ بنا دیا تھا، اب دہشت گرد تنظیموں کے اقدامات سے مزید حقیقی خطرہ لاحق ہے۔ اسی طرح وہ ممالک جو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں سے لیس ہیں اور کسی بھی وجہ سے اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قانون کی پابندی نہیں کرتے، ان سے بھی خطرات لاحق ہیں۔ اس صورت حال میں دنیا میں موجود ریاستوں کا ایک ایسا مضبوط گروہ قائم کرنا ضروری نظر آتا ہے جو انسانی حقوق کے لیے کام کرے اور ہر ایسے اقدام کی مخالفت سنجیدگی سے کرے جس سے انسانی حقوق متاثر

ہوتے ہوں، چاہے وہ خلاف ورزی کہیں بھی ہورہی رہو۔ عالمی امن کے قیام کا انحصار عالمی برادری کی موجودہ خطرات اوران خطرات کے پیدا ہونے کی وجوہات پر قابو پانے کی صلاحیت پر ہے۔

اقوام متحدہ کی تشکیل نو

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ بے لگام حکومتوں اور غیر حکومتی عوامل سے نمٹنے کے لیے جو دہشت گردی کی حکمت عملی پر کاربند ہیں ایک فعال اقوام متحدہ کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے بااختیار ادارے کے قیام کی کوشش سے نہ صرف دوہرے معیار کا خاتمہ ممکن ہو سکے گا بلکہ سلامتی کونسل کی رکنیت کے حوالے سے بھی تشکیل نو ممکن ہو گی۔ اس دوران اقوام متحدہ کو انسانیت کے نام پر کیے جانے والے اقدامات کی وجوہات کو بھی دوبارہ مرتب کرنا ہوگا جس میں یہ چیز پیش نظر رکھنا ضروری ہوگی کہ دنیا کے وہ تمام شہری جو مختلف طاقتوں کے ظالمانہ ٹکراؤ سے متاثر ہوتے ہیں انہیں غیر جانبدار اور آزادانہ امداد مہیا کی جا سکے۔

البتہ قومی ریاستوں پر مشتمل عالمی برادری فی الوقت اس قسم کی تشکیل نو کرنے کی صلاحیت سے کوسوں دور ہے۔ ایسے میں اگناتیف کا یہ موقف تھا کہ جب مندرجہ بالا حل ممکن نہیں ہے تو مداخلت ممکن طور پر نہ کرنے سے امریکہ کے زیر سایہ مداخلت کرنا بہتر تو ہوسکتا ہے، مگر مسئلے کا حل نہیں ہے۔ (یہ امر غور طلب ہے کہ ریاستی دہشت گردی کے حوالے سے امریکہ کے اقوام متحدہ کے فیصلوں واور اصولوں سے انحراف کے رویے کو اکثر مغربی مفکرین اہمیت دیتے نظر نہیں آتے۔ انہیں چھوٹی چھوٹی تنظیموں کی اکادکا کارروائیاں نظر آجاتی ہیں مگر سکولوں اور باراتیوں پر بم برسانے جیسی اجتماعی نسل کشی کی امریکی کارروائیوں میں کوئی تخریب نظر نہیں آتی)۔ اس سے صرف ان ممالک کی حکمت عملی کو اور ان دہشت گرد تنظیموں کے خیالات کو فروغ ملے گا جو پہلے ہی بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو مسترد کیے ہوئے ہیں۔ امریکہ کا سامراجی رویہ اور اس کی تنہا اور پہلے حملہ کرنے کی سوچ اقوام متحدہ اور بین الاقوامی قانون کے نفاذ کے خواہاں عناصر کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

ایک مزید پرامن دنیا کے قیام کے لیے ممکنہ لائحہ عمل

موجودہ رویوں میں عالمی سطح پر تبدیلی آنے کے چار ممکنہ راستے ہیں:

۱۔ امریکہ کو یورپ کی مسابقت سے خطرہ،

۲۔ ایشیا کی طرف سے مسابقت کا خدشہ،

۳۔ امریکہ کے حکمران اتحاد میں تبدیلی، یا

۴۔ جنوب کی گنجان آباد ترین ریاستوں کا آپس میں اتحادِ نو؛

یہ تمام امکانات مشکلات سے پُر ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا، یورپ کی طرف سے امریکہ کے خلاف معاشی مسابقت کی بنیاد پہلے ہی وجود ہے۔ البتہ یورپ کے لیے اجتماعی دفاع اور ایک آزاد عسکری اہلیت حاصل کر لینے کی امید فی الحال بہت کم ہے۔ اس رخ پر کسی بھی سفر کا دارومدار برطانیہ میں یورپ کے بارے میں موجود سوچ کی تبدیلی اور یورپ کے دفاعی صلاحیت میں نمایاں اضافے کا فیصلہ کر لینے پر ہے۔ دراصل اس بات کی قوی امید ہے کہ یورو امریکی ڈالر کے بنیادی مقابل کے طور پر عسکری طاقت میں اضافے کے فیصلے سے کہیں پہلے آ جائے گا۔ اس وقت امریکہ کا رویہ مزید جارحانہ ہو جائے گا۔

ایشیا کی آبادی اور معیشت کا حجم جو اس کی روزمرہ تجارت میں مستحکم حالت سے اس وقت بھی ہویدا ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ مستقبل میں طاقت کا توازن ایشیا کی طرف ہوگا۔ یہ بھی غور طلب امر ہے کہ برصغیر کی جوہری طاقتیں اس وقت کیا رویہ اختیار کریں گی۔ اس بات کی پہلے ہی امید کی جا رہی ہے کہ چین، جاپان اور جنوب مشرقی ایشیا کی کئی ریاستوں میں مزید قریبی تعلق استوار ہو سکتا ہے۔ لیکن طاقت کے اس دھڑے کا امریکی سامراجیت کا مقابلہ کرنے کا اہل بن جانا پھر بھی بعید از قیاس نظر آتا ہے۔

اجارہ داری کا رویہ امریکہ کی جڑوں میں اندر تک اُتر چکا ہے جسے سرد جنگ کی وجہ سے گزشتہ پچاس برسوں میں کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ کلنٹن انتظامیہ کا آزاد معیشت قائم کرنے کی طرف رجحان اور اسرائیل جیسے اتحادیوں کے بارے میں اس کا دوہرا رویہ بذات خود حالات کو غیر متوازن کرنے والے تھے اور عالمی امن کے لیے خطرہ تھے۔ تاہم ڈیموکریٹک انتظامیہ کے آخری دور میں اقوام متحدہ جیسے اداروں کے تشخص کو پامال کرنے اور بین الاقوامی قانون کی دھجیاں بکھیرنے کے بجائے کثیر جہتی دنیا کے قیام کی سنجیدہ کوششیں کی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں بنیادی طور پر اہم چیز یہ ہے کہ اگر امریکہ کے خوشحالی کے غبارے

میں سے ہوا نکل گئی تو عالمی معیشت میں بھی تناؤ آ جائے گا جس سے جنوب کے ممالک کو اس میں وہی کردار ادا کرنے کا موقع نصیب ہوگا جو ۱۹۳۰ء کے یورپی معاشی بحران کے زمانے میں اس وقت غریب ممالک کو میسر آیا تھا اور جس سے ان ممالک میں معاشی ترقی اور تبدیلی آئی تھی۔ اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ جنوبی ممالک دنیا میں دولت کے مراکز کی طرف سے قائم کردہ معاشی نظام کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔ معاشی طور پر جنوبی علاقے میں ترقی کا انحصار جنوبی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے اہم ممالک کے درمیان باہمی تجارت اور بین الاقوامی تجارت کے فروغ پر ہے۔ اگر یہ ممالک انفرادی طور پر دنیا کے دولت کے مراکز سے مقابلہ کریں تو یہ ان کے لیے مشکل صورت حال ہوگی۔ البتہ اس ترقی کا بعد میں ان ممالک کی عسکری طاقت پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔

حاصل کلام

پرامن بقائے باہمی کے امکانات کا دارومدار کثیر جہتی نظام اور فعال اداروں کے فروغ اور علاقائی اور عالمی حکومتی نظام کے وضع کرنے پر ہے۔ امریکہ کبھی بھی کثیر جہتی نظام کے لیے سنجیدہ نہیں رہا۔ جوزف نائے نے کثیر جہتی نظام کا آزادترین طریقہ امریکہ کے لیے وضع کیا ہے تا آنکہ وہ اپنی معتدل طاقت قائم رکھے جو لازمی طور پر امریکہ کے ان اقدامات کی طرف اشارہ ہے جن سے اس نے دنیا میں واحد طاقت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ کثیر طرفی نظام کی بنیاد ترقی اور پرامن بقائے باہمی کی ان مختلف النوع نظاماتی تصورات پر رکھی جانی چاہیے جو مختلف قوموں کے سرمایہ داریوں کے مابین ہوں۔

بش کی قومی سلامتی کی حکمت عملی عالمگیریت کے حامیوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ دیگر قومی ریاستوں کے گروہ امریکہ کی برتر حیثیت پر قابو پاسکتے ہیں اور انہیں ایسا کرنا چاہیے۔ عالمی معاشرتی دھاروں سے ایک طاقت ور سامراجی سلطنت کے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ دنیا میں ایسی سیاسی سماجیت کی ضرورت ہے جو حکمت عملی کے تحت چلے اور جو شہریوں کو اپنی زندگی بہتر بنانے اور جدید دنیا میں قدم رکھنے کے قابل بنائے۔ ہارڈٹ (Hardt) اور نیگری (Negri) کے خیالات تو سامراجی سلطنتوں کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف پنپنے والی تحاریک میں اور زیادہ ہلچل مچا دی ہے۔

میرے خیال میں بش کی قومی سلامتی کی حکمت عملی کے تناظر میں دراصل ہم ایک ایسی سلطنت کے موجود کی طرف اشارہ دیکھتے ہیں جو بہت ترتیب سے موجودہ قومی ریاستوں کے جدید دور میں اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ یہ ایسا دور ہے جہاں ہم فی الوقت ایک ہی بڑی طاقت کو اپنی مضبوط حیثیت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ بین الاقوامی تاریخ کے اس باب میں انیسویں اور بیسویں صدی باہم برسرپیکار بڑی طاقتوں کے آپس کے تقابل سے بالکل مختلف نظر آتی ہیں۔

قومی سلامتی کی حکمت عملی میں وضع کردہ امریکہ کا واحد طاقت کے زور پر قابض رہنے کا معیار جو یک طرفہ طاقت ہونے کے فلسفے میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے یا طویل مدت کے لیے ہے یا مختصر؟ یہ ابھی تک ایک کھلا سوال ہے۔ اس کا دارومدار ایک طرف تو اس بات پر ہے کہ یورپ کی قومی ریاستیں کس حد تک باہمی اتحاد قائم کر کے ایک بااثر یورپی دفاعی نظام وضع کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں تو دوسری طرف اس بات پر کہ چین اپنی معاشی ترقی کو قائم رکھتے ہوئے اپنے دفاعی نظام میں جدت لانے میں ایک بااختیار سیاسی حکومت کے مقابلے میں کس قدر کامیاب ہوتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں میں امریکہ کی مطلق العنانیت کے مقابل دنیا میں ایک ایسے کثیر جہتی نظام کے قیام کے اامکانات جو متحدہ مغربی یورپ اور ایشیا میں مضبوط چین پر مشتمل ہو، ہنوز غیر واضح ہے۔ مستقبل قریب میں امریکہ میں یک طرفہ نظام اور کثیر جہتی نظام کے حامیوں کے درمیان موجود کشمکش ہی کسی فوری تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہونے کی سب سے قوی امید کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے جو موجودہ امریکی اجارہ داری کے تصور کا مقابلہ کر سکنے کی استعداد رکھتی ہے۔ بعدازاں جنوب کی قومیں بھی موجودہ مشکل حالات میں کوئی راہ نکالنے کی اہلیت حاصل کر پائیں گی۔